بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

کراچی سے ہمارے ایک کرم فرمانے ہمیں مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا ہے:

"ترجمان القرآن اپریل ۱۹۶۵ء نظر سے گزرا۔ اشارات میں آپ نے صفحہ ۴ پر لکھا ہے:

"جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی اور اجتماعی زندگی میں جتنی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں لانے کی آرزومند ہوگی اتنے ہی اس کے عزائم وسیع اور مزاج آمرانہ ہوگا"۔

اگر آپ اس اصول کی صحت پر یقین رکھتے ہیں تو ایک سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک انقلاب لانا چاہتی ہے اور اجتماعی زندگی میں ایک تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے اس صورت میں جماعت اسلامی اور اس کی قیادت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عین اسی اصول کے مطابق جب کچھ حضرات جماعت کے مزاج اور اس کی قیادت کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں تو پھر آپ کو بجائے جواب دینے اور مدافعت کرنے کے فراخ دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ توقع ہے کہ جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں گے"۔

اس خط کا ایک نہایت مختصر جواب بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن جماعت اسلامی کی قیادت کے بارے میں چونکہ مختلف حلقوں میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے اس لیے ہم اس معاملہ پر پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ جن ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہو گئے ہیں وہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

جہاں تک میری اس عبارت کا تعلق ہے کہ جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی ہوگی اتنے ہی اس کے

عزائم وسیع اور اس کا مزاج آمرانہ ہوگا، اس کے بارے میں میری درخواست یہ ہے کہ براہِ کرم میری ان معروضات کو اُس سیاق و سباق میں رکھ کر ملاحظہ فرمائیں جس میں مَیں نے یہ بات کہی ہے۔ مَیں ذکر یہ کر رہا تھا کہ مسلمان بحیثیت ملّت اُن اقدارِ حیات کو اپنانے کے لیے ابھی تک آمادہ نہیں ہو رہے جو مغرب اُن پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے مشرقی ممالک میں جمہوریت کے بجائے آمریت کو پروان چڑھانے کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے اور ایک مختصر سے مغرب زدہ طبقے کو، جو دینِ مغرب پر نہ صرف دل و جان سے ایمان رکھتا ہے بلکہ مسلمان ممالک میں اس کا تسلط قائم کرنے کا بھی متمنی ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے آلۂ کار بنا رہا ہے ظاہر بات ہے کہ اس طبقے کی سیادت جمہوریت کے ذریعہ تو قائم نہیں کی جا سکتی، اس لیے اہلِ مغرب مشرق میں ہر جگہ، اور خصوصاً مسلمان ملکوں میں آمریت کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ اُن کے یہ عزائم مسلمانوں کے لیے جتنے خطرناک ہوں گے، انہیں ان سے اتنی ہی وحشت ہوگی، اس لیے اُن کی تکمیل کی اگر کوئی صورت ممکن ہے تو وہ صرف یہ کہ یہاں بالجبر مغرب کے نظامِ حیات کو نافذ کیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ چیز عوام کی رائے پر چھوڑ دی جائے تو اس کی کامیابی کے امکانات بہت تاریک ہو جاتے ہیں مسلمان قوم کے اندر ان مادی اقدار کو اُتارنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ قوم اتنی بیوقوف بھی نہیں ہے کہ جان بوجھ کر آبِ حیات کے بجائے زہر کو شوق اور رغبت کے ساتھ اپنے حلق میں اتارنے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ اگر آج دین سے برگشتہ نظر آ رہی ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر تیار نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس "شہادت گہِ الفت" میں قدم رکھنے کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ اُسے اسلام سے محبت اور عقیدت ضرور ہے اور وہ اسے ہر دوسرے نظام کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھتی ہے لیکن ماحول نے اسلام کے لیے جس طرح حالات کو ناسازگار بنا رکھا ہے اُس سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کے اندر جذبہ اور ولولہ باقی نہیں رہا۔ اگر اقتدار قوت و طاقت سے کام لے کر دیدہ و دانستہ اسلام کے لیے ناقابلِ برداشت مشکلات پیدا نہ کرے تو مسلمان اسلام کی عملداری کو بخوشی قبول کریں گے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا کی جو قوم یا قیادت مسلمانوں کے

اندر اُن کی پسند اور مرضی کے علی الرغم کوئی ایسا نظامِ حیات مسلط کرنے کا داعیہ رکھتی ہو وہ اپنے ان انقلابی عزائم کو آمریت کے ذریعہ ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔

میری یہ گذارش ہر قیادت کے بارے میں ایک عام اصول کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کا تعلق مسلمان ممالک کی موجودہ صورتِ حال سے ہے، اور اس کی صحت کو ہر وہ شخص پوری طرح جان سکتا ہے جو مسلمان ممالک کے حالات پر کچھ بھی نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کی صراحت میں نے زیرِبحث مضمون میں صفحہ ۴ اسے آگے پُوری طرح کر دی ہے۔

باقی رہا جماعت اسلامی اور اس کی قیادت کے آمرانہ مزاج کا مسئلہ تو اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات جماعت اور اس کے قائدین پر آمریت کا الزام لگاتے ہیں وہ یا تو جماعت اور اُس کے نظام کے بارے میں کوئی معمولی واقفیت بھی نہیں رکھتے، یا وہ کسی شدید غلط فہمی میں گرفتار ہیں۔ جو شخص بھی جماعت کے متعلق کوئی براہِ راست معلومات رکھتا ہے، یا اُس کے دستور پر اُس نے کبھی اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالنے کی تکلیف گوارا کی ہے وہ جماعت کے بارے میں اتنی غلط بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔

اس مسئلہ کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آمریت کا خمیر کن عناصر سے اٹھایا جاتا ہے اور آمریت کس مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو جنم دیتی ہے اور اس سے انسان کس نوعیت کی روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

آمریت درحقیقت ایک روگ ہے جو اقتدار اور عزو جاہ کی ایک نہ مٹنے والی ہوس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ عارضہ اپنی بالکل ابتدائی منزل میں قطعاً خطرناک دکھائی نہیں دیتا، بلکہ اگر اس کا تجزیہ کرتے چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز بہت سے دوسرے روحانی عوارض کی طرح انسان کی ایک فطری اور معصوم خواہش سے ہوتا ہے جو اوّل قدم پر ہی ایک غلط رُخ اختیار کرنے کی وجہ سے انسان کو تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ انسان کو اپنی

رائے کا کتنا احترام ہوتا ہے۔ یہ احساس بالکل فطری ہے، کیونکہ انسان اگر اپنی رائے کو خود ہی بے وزن سمجھنے لگے تو پھر نہ تو اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے، نہ وہ اپنی رائے کے مطابق کوئی عملی قدم اٹھا سکتا ہے، اور نہ اس رائے کو دوسرے کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ جس چیز کی صحت کے بارے میں انسان کو خود ہی کوئی یقین اور وثوق نہ ہو وہ چیز آخر اُس کے عمل کا محرک کس طرح بن سکتی ہے۔ اپنی رائے کے اس احترام میں بذات خود کوئی قباحت نہیں، اور اگر یہ جذبہ اپنی فطرت کے حدود کے اندر رہے تو اس سے فرد اور معاشرے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن یہی معصوم سا جذبہ جب اپنی فطری حدود سے تجاوز کر کے خود پسندی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس سے فرد اور معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی جذبہ کی غلط صورت انسان کے قلب و دماغ میں اس باطل خیال کی آبیاری کرتی ہے کہ اُس کا ذہن سچائی کا واحد سرچشمہ ہے، جو چیز بھی اس منبع سے نکلتی ہے وہی بالکل برحق اور صحیح ہے اور اس کے مقابلے میں ہر دوسرے دماغ کی سوچی ہوئی تدبیر لازمی طور پر غلط اور احمقانہ ہے۔ اس طرح اپنی رائے کے احترام کا وہی پاکیزہ اور فطری جذبہ، جو جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی فرد کی شخصیت کے نشوونما کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، غلط صورت اختیار کرنے کے بعد خود پسندی، خود رائی اور استبداد جیسے خوفناک مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس شخص کی انانیت اپنے سامنے کسی دوسرے کو گوارا ہی نہیں کر سکتی۔ اُس کے اندر تکبر اور نخوت کے جراثیم پلنے لگتے ہیں۔ وہ ہر وقت دوسروں کی تضحیک و تذلیل کے درپے رہتا ہے اور شعوری اور غیر شعوری طور پر ان پر چوٹیں لگا کر اپنی انانیت کی تسکین کا سامان کرتا ہے، مگر خود اپنے بارے میں اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ کسی معمولی اختلاف یا کسی نرم سے نرم تنقید کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی ایک جملہ بھی وہ اپنی شان کے خلاف سنتا ہے تو اس کی انانیت فوراً بپھر کر انتقام لینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ جب تک اس جسارت کا ارتکاب کرنے والے کو بالکل برباد نہ کر دے اُس وقت تک اُسے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اور اُس کے معتوب کو اگر تکلیف پہنچتی ہے

تو خود پسند انسان اُس میں گونا گوں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ عمل جب مدت تک کام کرتا رہتا ہے تو اس سے اُس کی پوری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

انانیت اور آمریت ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم عناں ہو کر آگے بڑھتی ہیں۔ آمریت کے اردگرد خود فریبی کی جتنی بیشمار تہیں چڑھی ہوئی ہیں انہیں اگر ہٹا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ روگ ابتدائی صورت میں انانیت کی طرح کسی اعتبار سے خطرناک نہ تھا۔ بلکہ محض غلط رُخ اختیار کرنے کی وجہ سے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کی اصل صرف اسی قدر ہے کہ دنیا کا ہر فرد چونکہ الگ الگ شخصیت رکھتا ہے اس لیے اس کے حفظ و بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کے استحکام کا سامان کرے، کیونکہ اگر وہ اسے مستحکم کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تعمیرِ شخصیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں نہ صرف اپنے مرتبہ و مقام کو متشخص کرے بلکہ اُس کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے بھی سرگرم عمل رہے۔ معرفتِ ذات صرف اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس نہیں بلکہ انہیں دُور کرنے کے لیے فکر و اضطراب، اور فرد اور معاشرے، معاشرے اور کائنات اور اس کے خالق اور مالک کے ساتھ لاتعداد رشتوں کے اندر اس کے اپنے مقام کی صحیح پہچان ہے۔

ایک شخص اگر اس وسیع و عریض کائنات کے اندر اپنے مقام کی صحت کے ساتھ نشاندہی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ صرف فرد اور معاشرے کی ہی نہیں، بلکہ پُوری کائنات کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ اصل مصیبت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ اپنے حقیقی مرتبے اور مقام سے تجاوز کر کے نہ صرف اپنے ابنائے جنس کے جائز حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے بلکہ خالق اور مالک کے حقوق پر بھی دست درازی شروع کر دیتا ہے۔ اپنی ذات کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات اور دوسروں کے حقوق کے غصب کرنے کا رجحان ایک نفسیاتی بیماری ہے جو آمرانہ ذہنیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس بیماری کی وجہ سے انسان کے اندر خود پسندی اور اپنی قابلیت کا حد سے بڑھا ہوا پندار اُبھرتا ہے اور وہ شخص معاشرے سے وہ مراعات طلب کرتا ہے جس کا وہ کسی اعتبار سے بھی مستحق نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ غلط خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کا مرکز ہے اور نوعِ بشری اور اُس کے سارے وسائل محض اس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ صحیح اور برحق وہ چیز ہے جسے اس کا ذہن صحیح اور برحق سمجھے اور باطل وہ ہے جسے اس کا دماغ باطل قرار دے۔ اُس کی ذات کے سوا معاشرے میں کسی دوسرے انسان کے کوئی مستقل حقوق نہیں ہیں، بلکہ دوسرے انسانوں کے وجود کی غایت صرف اسی کی خدمت اور چاکری ہے۔

یہ غلط خیال اگر محض خیال کی دنیا تک محدود رہے تب بھی نتائج کے اعتبار سے بڑا خطرناک ہے، لیکن جب یہی خیال عملی صورت اختیار کرتا ہے تو اس سے پوری معاشرتی زندگی کا سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان اپنے فطری حقوق سے آسانی کے ساتھ دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہوتے، اس لیے جبر اور سازش کے ذریعہ انھیں ان سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ اگر یہ بات کہی جائے کہ آمریت کا قصر صرف جبر کی بنیاد پر تعمیر کیا جاتا ہے اور سازش اس میں گچ اور گارے کا کام دیتی ہے تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ آپ ماضی و حال کے کسی آمرانہ نظام کا تجزیہ کریں تو آپ کے سامنے یہ حقیقت بالکل کُھل کر آجائے گی کہ سازش سے اس نظام کا آغاز ہوا، جبر و استبداد نے لوگوں پر اسے مسلط کیا، اور جوڑ توڑ، جھوٹ اور فریب کے ایک وسیع سلسلہ نے اس کے تسلط کو کچھ دیر تک قائم رکھا۔

یہ نظام چونکہ ایک فرد کی حد سے بڑھی ہوئی حرص کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے یہ سارا نظام محض اُسی ایک شخصیت کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس امر کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے کہ اس مرکزی شخصیت کو مافوق البشر ثابت کیا جائے۔ انسانوں کے دل و دماغ جب تک اُسے ایک غیر معمولی ہستی تسلیم نہیں کرتے اُس وقت تک وہ اپنے حقوق

سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر وہ اُسے اپنے جیسا ایک عام انسان سمجھ لیں تو پھر وہ اسے منزہ عن الخطا کس طرح مان سکتے ہیں اور اس کی ہر بات کو بلا چون وچرا کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں تو وہ اُس کے کارناموں پر کھلے بندوں نقد و جرح کریں گے اور اس کی غلطیوں پر اُسے ٹوکیں گے۔ اسی بنا پر آمریت کے لیے سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ غلط پراپگنڈے کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں کو بالکل ماؤف کر دیا جائے۔ اور اُن کے اندر سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے۔ وہ جدھر بھی نگاہ دوڑائیں انہیں آمر کی ذات کے سوا کوئی دوسری شخصیت نظر نہ آئے، اور اُن کے دماغ میں یہ غلط خیال بالکل راسخ ہو جائے کہ اُن کا سربراہ مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مالک ہے اور اُس کی سربراہی میں ہی قوم اور ملک کی فلاح مضمر ہے۔ اُس کی اگر کسی بات کو رد کر دیا گیا تو اس کی صدیوں تک تلافی ممکن نہ ہو گی۔ جو لوگ اُس کے کارناموں کے خلاف تنقید کرتے ہیں وہ وطن اور قوم کے دشمن ہیں، عوام الناس کی فلاح و بہبود ان کو گوارا نہیں ہے، اور وہ خلوص اور دیانت داری سے یکسر عاری ہیں۔ اُن کی تنقید میں خیر کا کوئی پہلو نہیں اور اس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ انسانیت کے اس "نجات دہندہ" کی خدمات جلیلہ سے قوم اور وطن کو محروم کر دیا جائے۔

ایک طرف قوم کے قلب و دماغ میں اس قسم کے باطل خیالات کی پرورش کا سامان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ سربراہ صاحب اس نوعیت کی کارگذاریوں میں مصروف رہتے ہیں جن سے اُن کی شخصیت کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے چن چن کر اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کرتے ہیں جو ذہنی استعداد، اخلاق و عادات اور سیرت و کردار کے اعتبار سے قوم میں مقبول نہ ہوں، تاکہ ان کے ہالے میں "آمر" کی شخصیت غیر معمولی طور پر نمایاں ہو سکے۔ آج تک کسی آمر نے بھی اپنی رفاقت کے لیے ایسے افراد کا کبھی انتخاب نہیں کیا جو سیرت کے لحاظ سے مضبوط اور اپنی قوم کے اندر عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جانے والے

ہوں۔ ایک آمر کو انہی لوگوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کا اپنا کوئی ماضی نہ ہو، جو اپنے اس اعزاز و اکرام کے کسی طرح مستحق نہ ہوں، بلکہ اس کے لیے سراسر آمر کی چشمِ کرم کے محتاج ہوں جنہیں اقتدار جس وقت چاہے بیک بینی و دو گوش نکال باہر پھینکے اور اُن کے اس انجام پر کسی کی زبان سے کوئی حرفِ تاسف ادا نہ ہو۔

پھر اس نظام کے حفظ و بقا کے لیے ایک عام قاعدہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ معاشرے کے اندر مفادات کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزیرے بنا دیئے جائیں اور باقی سوسائٹی کو زیردست آزاری اور ظلم و تشدد کے طوفانوں کی نذر کر دیا جائے تاکہ عوام ان جزیروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوں اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اُن کو کبھی خیرباد کہنے کی جسارت نہ کر سکیں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، دنیا کے جتنے آمرانہ نظام مختلف شکلوں میں دنیا کے نقشے پر اُبھرے ہیں۔ اُن میں مفادات کے اِن جزیروں کا قیام بالکل ناگزیر دکھائی دیتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا نظام سمٹ کر صرف انہی جزیروں تک محدود ہو گیا ہے۔ "آمریت اصول اور عمل میں" (DICTATORSHIP IN THEORY AND PRACTICE) کے فاضل مصنف نے اسی ضمن میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ آمرانہ نظام کے اندر مختلف سیاسی ادارے اور پارٹیاں جس انداز سے تشکیل پاتی ہیں وہ جمہوری نظام سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ جمہوری نظام میں ان اداروں اور جماعتوں کی قوت و طاقت کا سرچشمہ رائے عامہ ہے اس لیے ان کی جڑیں عوام کے اندر جتنی گہری ہونگی اتنی ہی وہ طاقتور اور توانا ہونگی۔ مگر آمرانہ نظام میں ان کی حیثیت ایک ایسے درخت کی سی ہوتی ہے جس کی کوئی جڑ نہ ہو، اور اُسے اوپر سے معاشرے میں نصب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان اداروں اور جماعتوں کے اندر اُس وقت تک زندگی کے آثار رہتے ہیں جب تک اقتدار کا ابرِ کرم ان پر مسلسل برستا ہے۔ لیکن جس لمحہ اقتدار آنکھیں پھیر لے اسی وقت ان پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ اسی موضوع پر ابھی حال ہی میں JOHN STRACHEY کا ایک بڑا فکر انگیز مضمون THE CHALLENGE OF DEMOCRACY

کے نام سے انگلستان کے ایک مشہور رسالے میں شائع ہوا ہے۔ یہاں ہم اُس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن میں آمرانہ نظام کی خصوصیات کا بڑی عمدگی سے ذکر کیا گیا ہے:۔

"غیر جمہوری معاشروں نے اگرچہ بلبشتر معاملات میں کسی اچھی کارکردگی کا ثبوت نہیں دیا، تاہم ہمیں خال خال مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں انہوں نے نسبتاً اچھے کام سرانجام دیئے ہیں۔ اُن کی کارکردگی خواہ اچھی تھی یا بُری، لیکن اُن کے اندر ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ آمریت چاہے کسی لباس میں جلوہ گر ہوئی ہو —— بادشاہت، مذہبی اجارہ داری، جاگیرداری، سرمایہ داری یا نوکر شاہی، ان میں سے ہر ایک نے عوام کو خوب لوٹا ہے۔ اور جب میں لوٹ کھسوٹ کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان تمام آمروں نے عوام کے حقوق کی حفاظت و پاسبانی کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کی ہے ....

اس لیے اگر عوام اپنے مفادات کے تحفظ کے خواہشمند ہیں تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا نظام نافذ کریں جو نہ صرف اُن کی تمناؤں کا مظہر ہو بلکہ جسے وہ اپنے ہاتھوں سے خود چلا بھی سکیں۔ جو حکومت بھی عوام کے ہاتھوں سے نکل کر کسی دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو گی۔ وہ بالآخر اُس شخص یا طبقے کے مفادات کی حفاظت کے لیے وقف ہو کر رہ جائے گی۔"

یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ غلط طرزِ فکر اور طرزِ عمل جو آمریت کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی غور کریں کہ کیا یہ بیمار ذہنیت کبھی بھی اُس شخص یا گروہ کے اندر پرورش پا سکتی ہے جو اللہ اور اُس کے رسُولوں پر ایمان رکھتا ہو، جسے اس بات کا پُورا الیقین ہو کہ اُسے دنیا میں ہرگز غیر مسئُول پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ آخرت کے دن اُسے اپنے ہر عمل کے بارے میں قادرِ مطلق کے سامنے اپنا حساب پیش کرنا ہو گا۔ پھر وہ شخص یا گروہ ان اعتقادات کو صرف خود ہی اپنانے پر اکتفا نہ کر رہا ہو

بلکہ پوری نسلِ انسانی کو اس امر کی دعوت دے رہا ہو کہ آؤ خدا کی غلامی کو قبول کر کے اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلائیں، دنیا کی تنگی و عُسر سے نکال کر اُن کو وسعت و کشائش و یُسر کی راہ دکھائیں اور ظلم و جور سے بچا کر عدل و انصاف کی فضا میں لائیں۔ بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اس لیے اُن کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی تقسیم کسی لحاظ سے بھی درست اور صحیح نہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ اُونچ نیچ شیطان کا بٹوارا ہے۔ تمام انسان ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔

مختصراً یہی ہے وہ دعوت جو جماعت اسلامی اور اس کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی برسوں سے پوری نوعِ بشری اور خاص طور پر مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔ اسی دعوت کی وضاحت میں انہوں نے ہر اُس نظریہ کا ابطال کیا ہے جو انسان کو اُس کے شرفِ انسانیت سے محروم کرے اور نوعِ بشری کے اندر اپنے مخصوص مفادات کی حفاظت کے لیے قلعے تعمیر کرے۔ ایسی جماعت کی قیادت انقلابی ہونے کے باوجود مزاج کے اعتبار سے کبھی آمرانہ نہیں ہو سکتی۔ جو قیادت اپنوں اور بیگانوں سے برملا یہ کہتی ہے کہ انسانیت کے اعتبار سے سارے انسان برابر ہیں وہ کس طرح آمریت کے سانچوں میں ڈھل سکتی ہے۔ محض کسی تحریک کا انقلابی ہونا اُس کے مزاج کو آمرانہ نہیں بنا دیتا۔ آمریت ایک روگ ہے جو غیر مسئول اقتدار کی ہوس سے انسان کو لگتا ہے۔ یہ ایک بیماری ہے جس کے جراثیم "انا و لاغیری" کے باطل احساس کے اندر پرورش پاتے ہیں۔

جماعت اسلامی کی قیادت کے مزاج کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر جمہوریت کی بنیادوں کی وضاحت کر دیں۔ حقیقی جمہوریت کا پہلا اصول یہ ہے کہ رنگ و نسل، زبان و وطن اور اسی قسم کے دوسرے مصنوعی اختلافات یکسر باطل ہیں اور ہر انسان واجب الاحترام ہے۔ انسانوں کے درمیان اگر کوئی حقیقی فرق ہے تو وہ فکر و نظر، سیرت و کردار، اخلاق و اعمال اور ذہنی و عملی صلاحیتوں کے لحاظ سے ہے۔

دوسرے، ہر ذی شعور فردِ معاشرہ کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے اجتماعی معاملات میں پوری آزادی کے ساتھ شریک ہو سکے۔

تیسرے، قیادت میں محض رائے عام کے تقاضے سے کسی خون خرابے یا غیر معمولی دشواری کے بغیر تبدیلی لائی جا سکے۔

جمہوریت کے یہ تین مسلّمہ اصول ہیں جنہیں اس نظام کی رُوح کہا جا سکتا ہے۔ اب آپ انہیں اصولوں کی روشنی میں جماعت اسلامی کی قیادت کا جائزہ لیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جماعت ہر قسم کی طبقاتی، نسلی، وطنی تفریق سے بفضلِ ایزدی بالکل پاک ہے؟ کیا کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ اس امر کی نشان دہی کر سکتا ہے کہ اس کے اندر کسی فرد کو بھی اس کے رنگ، نسل، زبان، وطن، طبقے یا دولت و ثروت کی بنیاد پر کسی طرح کی کوئی برتری حاصل ہے؟ ان کے مابین جو فرق بھی ہے وہ صرف اُن کے کردار، دین کی سمجھ بوجھ، دنیا کے معاملات سے واقفیت، اللہ کے دین سے وابستگی، اور خدمتِ دین میں سرگرمی کی بنیاد پر ہے۔ یہاں ہر شخص کو اس امر کا پورا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنے بھائی کی نہ صرف اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا احتساب کرے بلکہ اُس کی ذاتی اور نجی زندگی کے متعلق بھی اگر اُسے کوئی چیز دین و اخلاق کے لحاظ سے قابلِ اعتراض محسوس ہو تو اس پر گرفت کرے۔ اس احتساب سے کوئی فرد بھی محفوظ نہیں، اور اس معاملے میں امیرِ جماعت سے لے کر عام کارکنوں تک سب سے ایک ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کام کو رفقاءِ جماعت جس جذبے، ولولے، بلکہ بسا اوقات جس غیر معمولی جوش و خروش سے انجام دے دیتے ہیں اس سے کبھی کبھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ احتساب کی صحیح حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جس جماعت یا تحریک کے اندر تنقید و احتساب کی یہ آزادی ہو، اور سب شرکائے جماعت کے ساتھ، خواہ ان میں کسی کا مقام کتنا ہی بلند ہو، برابری کا سلوک کیا جائے، اس کی قیادت میں اگر آمرانہ رجحانات پرورش پانے لگیں تو یہ دنیا کے عجائبات میں سے

ایک عجوبہ ہوگا۔

اس ضمن میں یہ بھی دیکھیے کہ کیا کسی ایسی تحریک میں، جس کے اندر افراد اس واضح شعور و احساس کے ساتھ شامل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کا الٰہ، خالق، مالک، قانون ساز اور حقیقی فرمانروا ہے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم اُن کے مُطاع ہیں، آمریت جڑ پکڑ سکتی ہے۔ آمریت، جیسا کہ مَیں نے پہلے گزارش کی ہے، انسان کے اس غلط احساس پر پنپتی ہے کہ وہ غیر مسؤل ہے۔ لیکن جہاں لوگ ہر قدم پر اپنے بنائے ہوئے ضابطوں کے نہیں بلکہ اللہ کے قوانین کے پابند ہوں اور اسی پابندی کا عہد کر کے وہ جماعت میں شریک ہوئے ہوں، وہاں آمریت کے اُبھرنے کے کیا امکانات ہوتے ہیں۔

جماعت کی قیادت کے مزاج کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا اس قیادت نے بعض ایسے مخصوص مفادات قائم کر رکھے ہیں جن سے آمریت کے قیام میں مدد ملتی ہے؟ یہاں مرکزی امیرِ جماعت سے لیکر مقامی امراء تک پوری جماعت کے قائدین براہِ راست ارکان کی رائے سے منتخب کیے جاتے ہیں اور اس انتخاب میں کسی دباؤ یا لالچ سے کام لینے کا تو کیا سوال، کوئی شخص نہ خود امیدوار بن کر اٹھتا ہے، نہ اپنے لیے کوئی کنویسنگ کرتا ہے، بلکہ ارکانِ جماعت سے صرف یہ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں منصب کے لیے آپ کس شخص کو موزوں سمجھتے ہیں، اور اس طرح جس شخص کے حق میں بھی زیادہ رائیں آتی ہیں وہ منتخب ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ پر نیچے سے اُوپر تک تمام مجالسِ شوریٰ کے ارکان بھی عام ارکانِ جماعت کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ امیرِ جماعتِ اسلامی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کے پابند ہیں اور وہ اپنی مجلسِ عاملہ کو بھی مجلسِ شوریٰ کے ارکان ہی میں سے منتخب کرتے ہیں حالانکہ دنیا کے جمہوری ادارات میں کہیں بھی پارٹی کے صدر پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنی مجلسِ عاملہ کے ارکان لازماً جنرل کونسل کے ممبروں ہی میں سے مقرر کرے۔ سوال یہ ہے کہ اس دستور کے تحت اس طرح کے نظام میں

آمریت کا اُبھرنا آخر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض کرم فرماؤں نے تحریر کے ذریعہ اور بعض نے زبانی گفتگوؤں میں یہ کہا ہے کہ جو حضرات جماعت کے بیت المال سے تنخواہ لیتے ہیں وہ آخر آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ جماعت اور خصوصاً اس کے ہمہ وقتی کارکنوں پر اس سے زیادہ اور کوئی سنگین الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ معاشرے کے ایسے ذلیل افراد ہیں جنہوں نے چند ٹکوں کی خاطر اپنے ضمیر اور ایمان کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھ میں رہن رکھ دیا ہے۔ ہمارے ناقدین تو ان حضرات کو صرف بے ضمیر انسانوں کا ٹولہ ہی کہتے ہیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ اگر انہوں نے واقعی چند سکوں کے لیے جماعت کے ہمہ وقتی کارکن بننا پسند کیا ہے تو وہ ضمیر سے عاری ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و فکر سے بھی یکسر عاری ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب محض مفاد نے انہیں تحریک اسلامی سے وابستہ کر رکھا ہے تو انہوں نے ایک ایسی جماعت کے ساتھ منسلک ہونا کیوں پسند کیا جہاں بالکل معمولی سے معاوضے کے سوا انہیں کوئی دوسری چیز حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاوضے کے بدلے میں آخر انہیں کیا ملا۔ جماعت اسلامی حکومت کی کوئی منظور نظر جماعت نہیں کہ اس کی رکنیت سے حکومت کے ایوانوں میں ان کی پذیرائی ہو اور انہیں یا ان کے اعزہ و اقارب کو پرمٹ، لائسنس، یا اونچے سرکاری مناصب ملنے میں آسانی ہو۔ جس شخص کو اپنا دنیاوی مفاد عزیز ہے وہ اگر اس کے حصول کے لیے سرکاری جماعت کو چھوڑ کر ایک ایسی جماعت کی طرف آتا ہے، جس میں اُس پر پابندیاں ہی پابندیاں ہیں، جس میں وہ ہر وقت اپنے رفقاء کی تنقید کا ہدف بنا رہتا ہے جس کی رکنیت اُسے حکومت کی نظروں میں معتوب بنا دیتی ہے اور وہ اس کی ساری نوازشات سے یکسر محروم ہو جاتا ہے، بلکہ قید و بند کی مصیبتیں بھی مول لیتا ہے تو آخر ایسے شخص کے فاتر العقل ہونے میں کیا

شک کیا جا سکتا ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ایسے ہی ضمیر فروش ہیں تو جماعت اِن کے ضمیر کی جو قیمت دیتی ہے اُس سے تو کچھ زیادہ ہی قیمت آج کل مارکیٹ میں مل رہی ہے۔ آخر ان لوگوں کو کسی اور نے کیوں نہ خرید لیا؟

باقی رہی معاوضوں کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ جماعت کے صحت مند نشو و نما کے لیے یہ نہایت ضروری اور مستحسن اقدام ہے۔ جن حضرات سے جماعت پورا وقت لیتی ہے اُن کی معاش کی ذمہ داری بہر حال اُسے ہی قبول کرنی چاہیے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنا پورا وقت تو جماعت کو دے دیں اور اپنی گزر اوقات کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کریں؟ اگر ہمیں انسانوں کی عزّتِ نفس اور اُن کے وقار کی حفاظت کرنی ہے تو یہ اقدام ناگزیر ہے جن جماعتوں نے اپنے ہاں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں کیا اُن کے اندر جس قسم کی قباحتیں پیدا ہوئیں اُن کے بارے میں ہر وہ شخص جانتا ہے جو اُن سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اسی لیے اپنے اول روزِ تاسیس ہی سے یہ قاعدہ اختیار کیا تھا کہ اس تحریک کے کام کو چلانے کے لیے جن لوگوں کا سارا وقت لے لیا جائے اُن کی کفالت کا ذمّہ جماعت کو لینا چاہیے، اور یہ بار اُن لوگوں کو مِل جُل کر اٹھانا چاہیے جو جماعت کو اپنا پورا وقت نہیں دیتے بلکہ اپنی معاش کے لیے کام کرتے ہوئے باقی ماندہ اوقات اِس تحریک کے کام میں صرف کرتے ہیں۔

پھر جو معاوضے ان بیچارے کارکنوں کو ملتے ہیں اور ان معاوضوں کے صلے میں انہیں جن صبر آزما حالات سے گزرنا پڑتا ہے اُن کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عملی طور پر ان سے دوچار رہیں۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ہاں جن حضرات کو جو معاوضہ مل رہا ہے وہ اُن کی صلاحیت اور استعدادِ کار سے بہت ہی کم ہے اور اس کی حیثیت

کسی طرح بھی قوتِ لایموت سے زیادہ نہیں ہے جس سے وہ بیچارے بڑی مشکل سے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھتے ہیں۔ جماعت کے ان ہمہ وقتی کارکنوں میں ایک نہیں بلکہ کئی ایسے حضرات موجود ہیں جو اپنی علمی لیاقت، اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے فہم و تدبر اور اپنی قوتِ عمل سے معاشرے میں ہزاروں روپے کما سکتے ہیں لیکن وہ محض اللہ کے دین کی خاطر روکھی سوکھی کھا کر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا وقت گزار رہے ہیں۔ جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کوئی بیکار، نکمے اور بھک منگے نہیں جو سوسائٹی پر بار ہوں بلکہ وہ محنتی اور جفاکش لوگ ہیں اور یہاں انہیں جو کچھ ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ باہر کما سکتے ہیں۔ چنانچہ جن حضرات نے بھی جماعت کے کام کو چھوڑ کر دوسری جگہ وسائلِ رزق تلاش کیے ہیں انہیں اس مقصد میں گوناگوں کامیابی ہوئی ہے اور اُن میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو معاشی اعتبار سے بدحال ہو۔

یہ بات بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ ہمہ وقتی کارکن جن کا عزل و نصب ہر مقام اور علاقے کی جماعت میں خود اُسی مقام یا علاقے کے ارکانِ جماعت کی رائے سے ہوتا ہے، آخر مولانا مودُودی کے غلام کیسے اور کیوں بن کر رہیں گے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودُودی نہ ان کو مقرر کرتے ہیں، نہ ان کے معاوضے تجویز کرتے ہیں، نہ ان کی ترقی، تنزل یا علیحدگی میں ان کا کوئی دخل ہے، اور نہ ان کے معاوضے جماعت کے مرکزی خزانے سے دیئے جاتے ہیں کہ اسی اعتبار سے امیر جماعت کا ان پر کوئی دباؤ ہو۔ جماعت میں بجز مرکزی اسٹاف کے اور کوئی اسامی ایسی نہیں جس پر مولانا خود کسی کو مقرر کرتے ہوں۔ ہمہ وقتی کارکنوں کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے جو امراءِ شہر، امراءِ ضلع، اور امرائے حلقہ پر مشتمل ہے اور ان سارے حضرات کو ارکان منتخب کرتے ہیں۔ امیرِ جماعت اسلامی پاکستان آخری مرحلہ پر محض اس کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے آج تک کوئی ایسی مثال نہیں آئی جس میں ارکان نے کسی شخص کو کثرتِ رائے سے منتخب کیا ہو اور مولانا مودودی نے محض اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی بنا پر اُس کے انتخاب کو رد کر دیا ہو۔ یہ

(باقی ص ۶۹ پر)

(بقیہ اشارات)

حضرات اپنی "ملازمت" کے لیے اگر کسی کے منت کش ہیں تو وہ ارکان ہیں نہ کہ مولانا مودودی۔ اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ ارکان کو نظر انداز کرکے مولانا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر عرصہ دراز سے امیر جماعت چلے آرہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے سازشوں کے ذریعہ اپنے حامیوں کو بھاری بھرکم معاوضے دے دے کر اپنے حق میں رائے ہموار کر رکھی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مولانا ہی اس تحریک کے داعی ہیں۔ اُن کی دعوت پر ہی مسلمان مختلف حلقوں سے اس کی طرف ٹوٹ کر آئے ہیں۔ پھر مولانا نے ہی ہر قدم پر اس تحریک کی بڑی خوش اسلوبی سے رہنمائی کی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی غیر معمولی خوبیاں عطا کی ہیں۔ اُن کے اندر عزم و استقلال ہے، مشکلات سے نمٹنے کا حوصلہ ہے، اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت ہے، اور ان سب سے بڑھ کر خداوند تعالیٰ نے انہیں علم دین کے اندر ایک خاص بصیرت بخشی ہے جس کے مطابق وہ موجودہ حالات پر اُس کی تعلیمات کو منطبق کر سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس میں یہ ساری صلاحیتیں یکجا ہوں۔ اس بنا پر ارکانِ جماعت انہیں کسی لالچ کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے منتخب کر لیتے ہیں۔ ہمیں کئی مرتبہ یہ بھی کہا گیا کہ ہم محض دکھلاوے کے لیے کسی دوسرے آدمی کو اپنا امیر منتخب کریں اور مولانا محترم اُس کی رہنمائی کریں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ چیز غلط اور اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ جو شخص بھی جماعت کو فکری اور عملی رہنمائی دیتا ہے اُسے لازمی طور پر اس کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیے۔ ہم اسے منافقت سمجھتے ہیں کہ کوئی تحریک عملاً تو ایک شخص کی قیادت میں آگے بڑھے لیکن محض لوگوں کو

دکھانے کے لیے کسی دوسرے فرد کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ مولانا آج اگر اس تحریک کے سربراہ ہیں تو یہ اُن کی کسی سازش یا جوڑ توڑ کا نتیجہ نہیں اور نہ یہ اُن کے آمرانہ مزاج کی کرشمہ سازی ہے بلکہ اس کی بدیہی وجہ صرف ایک ہے کہ جماعت کے اندر صلاحیتوں کے اعتبار سے اُن کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اس تحریک سے جس قدر غیر معمولی لگن، اس سے جتنی گہری وابستگی اور اُن کے اندر جتنے بے مثال ایثار کا جذبہ موجود ہے وہ کسی دوسرے میں بظاہر نظر نہیں آتا۔ اس لیے رفقاء ہر انتخاب کے موقع پر اُنہی کی جامع صفات ہستی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا کسی اونچے سرکاری منصب پر فائز نہیں کہ لوگ محض انہیں خوش کرنے کے لیے اُن کے حق میں رائے دیں۔ اُن کے پاس کوئی دولت کے ڈھیر نہیں کہ اُس کے حصول کے لیے لوگ اُن کی خوشامد کریں۔ وہ اگر اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہی اس وقت اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔

بعض حضرات جماعت کے اندر جس یک رنگی کو دیکھ کر اسے آمریت کا نام دیتے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جن جمہوری تحریکات سے وہ عام طور پر آشنا ہیں اُن کے اندر فکر و عمل کی وحدت نہ ہونے کی وجہ سے زبردست انتشار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات انتشار ہی کو جمہوریت کا ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ جماعت کے رفقاء ایک خاص نظم کے پابند ہیں، اُن کے فکر اور اُن کے عمل میں کافی حد تک یک رنگی پائی جاتی ہے، ان میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے مفقود ہیں، وہ آزادی کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ حرکات نہیں کرتے، تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کی قیادت آمرانہ رجحان رکھتی ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو کسی اصولی تحریک کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جو جماعت ایک ہمہ گیر انقلاب کا عزم لے کر اٹھی ہے وہ آخر اپنے اندر متضاد عناصر کیسے جمع کر سکتی ہے۔ وہ جہاں اسلام دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہو گی وہ اس بات کی

بھی پوری طرح فکر کرے گی کہ اُس سے وابستہ ہونے والے لوگوں کے اندر فکر و نظر، جذبہ و احساس اور فعل و عمل کی وحدت ہو۔ البتہ اس بات کا پُورا پُورا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس وحدت میں جکڑ بندی کی کیفیت پیدا نہ ہونے پاتے، بلکہ افراد اپنی خداداد صلاحیتوں کے اختلاف کے باوجود ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے ایک عظیم نصب العین کی بنیاد پر ہم رکاب ہو کر آگے بڑھیں۔ اس صحیح اور فطری اتحاد فکر و عمل کو اور اس صحت مند نظم و ضبط کو آمریت کہنا انتہائی درجے کی سادگی ہے۔ یہ وحدت آمرانہ رجحانات کا نتیجہ نہیں بلکہ صحیح تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہے۔

ہم اپنی بات ختم کرنے سے پہلے جماعت کے ہمدردوں اور متاثرین کے بارے میں بھی ایک وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق بعض معترضین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان حضرات سے خدمت تو لی جاتی ہے لیکن انہیں رائے کا حق نہیں دیا جاتا۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ ہمارے ان متفقین میں سے بعض سیرت و کردار کے اعتبار سے کئی ایک ارکان سے بھی برتر ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر انہیں مقصد سے عشق ہے، وہ جماعت اسلامی کے طریق کار کو صحیح سمجھتے ہیں اور اُن ساری ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو ارکان پر عائد ہوتی ہیں، تو آخر انہیں رکنیت اختیار کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔ میں نے بارہا اپنے ایسے واجب الاحترام دوستوں سے اس کی وجہ دریافت کی اور ان میں سے بعض کو یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو ارکان پر عائد ہوتی ہیں، تو آخر انہیں رکنیت اختیار کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔ میں نے بارہا اپنے ایسے واجب الاحترام دوستوں سے اس کی وجہ دریافت کی اور ان میں سے بعض کو یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ بھی کرنا چاہا لیکن ان سب نے یہی کہا کہ وہ بعض مجبوریوں کی بنا پر "رکنیت کا خطرہ" مول لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے جماعت کے نظم سے باہر رہ کر ہی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی کہ انہیں رائے دہی کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اُن میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اگر وہ ارکان کے

دائرہ میں شامل نہیں ہو رہا تو اس میں جماعت کسی لحاظ سے بھی مانع نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنی مجبوریوں کی بنا پر ایسا کر رہا ہے۔ یہ حضرات بلاشبہ جماعت کے لیے بیحد مفید اور کارآمد ہیں امیر جماعت سے لیکر معمولی سے معمولی کارکن تک کی نگاہ میں ان کی عزت و تکریم ہے لیکن آخر جماعت کی پالیسی بنانے میں انہیں کس طرح براہِ راست شریک کر لیا جائے جبکہ اُس کے نفاذ کی عملی ذمہ داریوں میں وہ پوری طرح شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ اگر ووٹ کے حق سے محروم ہیں تو یہ قیادت کی کسی سازش یا کسی مخصوص مفاد کی حفاظت کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی اپنی صوابدید کا نتیجہ ہے۔ وہ جب چاہیں رکنیت قبول کر کے نہ صرف ووٹ دینے کے مجاز ہو سکتے ہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر جماعت کے اندر اونچے سے اونچا منصب بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جماعت اسلامی جس روز بنی تھی، اسی روز یہ اصول طے ہو گیا تھا کہ جماعت میں فیصلے کرنے کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہو گا جو ان فیصلوں پر عملدرآمد کرنے کی ذمہ داری بھی ساتھ ساتھ قبول کریں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جو نہ نظمِ جماعت کی پابندی اختیار کریں، اور نہ ذمہ داریاں اٹھانے میں شریک ہوں، بلکہ صرف باہر سے انفاق اور ہمدردی کرنے والے ہوں، تو اپنی مرضی سے جو تعاون بھی کریں، ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں، لیکن یہ حق انہیں نہیں دیا جا سکتا کہ فیصلے تو وہ کر دیں۔ مگر ان پر عملدرآمد کی ذمہ داری اٹھائیں صرف ارکانِ جماعت۔

(بقیہ مطبوعات)

کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور بے لاگ انصاف کی روایات قائم ہوئی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں جناب تنزیل الرحمٰن صاحب نے ان مقدمات کی رُوداد پیش کی ہے اور فیصلوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں دو امور نے بڑی افادیت پیدا کر دی ہے۔ ایک تو یہ کہ ذریعۂ بیان اُردو کو بنایا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ طویل قانونی بحثوں کا ملخص نہایت سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قانون کے طالب علم اور ملک کے پڑھے لکھے افراد اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

(ع۔ ف)